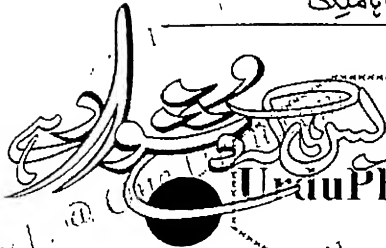


ماہنامہ



UrduPhoto.com



۱۱۱
 وادی جان نے گھبرا کر اپنے ارد گرد ہاتھ مارے،
 اور چشمہ مل جانے پر فحاشی سے آنکھوں پر فٹ کیا
 پھر سامنے کھڑی لڑکی کو سر سے پاؤں تک بغور دیکھا۔
 وہ بے نیازی سے پیدل پیدل پر کھڑی ہاتھ میں پکڑی
 گاڑی کی چابی گھماتی رہی۔

مارے حیرت کے وادی کی رنگی ناک کی پھٹکت پر
 پہنچ گئی اور منہ تھوڑا سا کھل گیا۔ اپنی ادراک میں تاج بیگم
 کچن سے برآمد ہو چکی تھیں۔

”ہائے آنٹی!“ وہ لڑکی آگے بڑھی اور تاج بیگم کے
 گالوں سے اپنے گال مس کرتے ہوئی
 وادی کا منہ مزید کھل گیا۔

تاج بیگم بھی بے تکلفی کے ان مظاہرہ کی عادی نہ
 تھیں۔ وہ کچھ جھینپیں کچھ شرابییں
 ”دیکھو بیٹی!“ وہ بمشکل بولیں۔

”ہوگا۔“

”ہاں مگر تمہیں اس سے کام کیا ہے؟“ وادی جو
 باری باری دونوں کا چہرہ دیکھ رہی تھیں۔ دخل اندازی
 کیے بنا رہ نہ سکیں۔

”نہیں آنٹی! بس میں چلوں گی۔“ اس نے وادی کو
 قطعاً لفٹ نہ کرائی اور بدستور تاج بیگم سے محو گفتگو
 رہی۔ ”اگر ضرورت پڑے گزر رہی تھی تو سوچا بیچ کر لوں۔۔۔“
 ”کیا سوچا؟“ وادی کو اس کی بات پہلے نہ پڑی۔ بڑی
 بے تابی سے انہوں نے ناپوچھا۔

”اس نے کیا کیا؟“ وادی پر ڈالنے والی اور ان کی بات کا
 جواب نہ پنا کچھ ضروری نہ سمجھا۔

”کوئی اچانک؟“ پھر پتی جاؤ بیٹی!“ تاج بیگم نے
 میزبان کے تقاضے نبائے۔

”ارے ہو! اس سے پوچھو آخر اسے کام کیا ہے؟“
 ہمیں بھی تو دیکھنا چاہیے۔ ہمارا بچہ ہے وہ۔“

”نہیں آنٹی! تمہیں کیا پتا؟“ اس نے پھر تاج بیگم سے

ناولٹ

Ujala @ One Urdu

لہا تو کیا، اسی سے اس کا سواصلاتی نظام قطعاً نہیں جڑ
 رہا تھا۔ "اے باپے!"
 وہ حسد و حسدوں پر کھٹ کھٹ کرتی چلی گئی۔
 داوی کی چٹیلی ہوئی نگاہوں نے آخر دم تک اس کا
 تعاقب کیا۔

"اری لشعازہ!" پھر وہ ہوش میں آکر نہایت جل
 کر بولیں۔ "بشت ڈھانے کو کوئی چادر نہ ملی تجھے، گلے
 میں دو بابت کا پھندا باندھ کر چلی آئی۔"
 انہیں اس کے گلے میں لپٹے لپٹے استی اسکارف کا کچھ
 مقصد سمجھ میں نہ آیا۔

"اری ہو! یہ جیند کن لڑکیوں کے چکروں میں لگا
 ہوا ہے؟" انہیں سخت تاؤ آ رہا تھا۔

"اوفوہ اماں! آپ تو رانی کا پھانسا لیتی ہیں۔" انہیں
 بیزاری ہوئی۔ "شام کے الٹیشوٹ میں اس کے ساتھ
 پڑھتی ہے یہ اللہ جانے کیا مشکل سامنا ہے۔ ایک
 مرتبہ پہلے بھی آئی تھی تب آٹلیا سو رہی تھیں۔ اس
 کے نوٹس جیند کے پاس ہیں وہی لینے آئی تھی۔"

"ہاں تو سو رہی تھیں، ہم بھی کھڑے کھڑے نہ رہتے
 ہیں۔ ارے چلے تو سرخوٹوں کا سا بچا ہے۔ کم بخت بارہ
 شریف بنی پھر رہی ہے۔"

"آج کل کی لڑکیاں ایسے ہی فیشن کرتی ہیں
 اماں۔" تاج بیگم بے نیازی سے بولیں۔ "فلمیں دیکھ
 دیکھ کر بگڑی ہوئی ہیں۔"

"آتمتہ نہیں دیکھی تھیں مردار کی؟ گویا میکہ لگوانے
 آئی ہو۔" فیض کے چاک گویا مجنوں کا چاک ہوئے۔ کم
 بخت کی شلوار کا بیفہ نظر آتا تھا۔ اوپا نیچے؟ پنڈلیوں پر
 یوں چڑھے ہوئے تھے جیسے اپنے گھر کا گھن دھوٹے
 دھوٹے چلی آئی ہو۔ بابت بھر کا رومال گلے میں کس
 لیا، سب فرض پورے ہو گئے اور ہو! انہیں یکایک
 خیال آیا۔ "یہ اس غریب کے بالوں کو کیا ہو گیا؟ ایک
 پی سفید، ایک کالی یہ کون سی بیماری ہے؟"

"بیماری نہیں اماں جان افیشن ہے یہ بھی۔ خود
 رنگواتی ہیں لڑکیاں۔ کبھی سنہری کبھی ریشمی۔"

"ہائیں؟" داوی کچھ دیر محو حیرت رہیں۔
 فتنہ لڑکی ہے! آنے دو جیند کو میں پوچھتی ہوں اس سے
 مہلا پرانی لڑکیوں سے نوٹ لینے کا اس کا کیا کام؟ پوچھ
 چاہیں تو باپ سے مانگے فقیر بنا پھرتا ہے۔
 "نوٹ نہیں اماں۔ نوٹس!" تاج بیگم نے دہائی
 دی۔ "تک نہیں سمجھیں گی۔"

"ہاں ہو! ایک تم ہی بقراط ہو۔" انہوں نے بان کا
 ٹکڑا غصے سے توڑا۔ "ہم تو اب جاہل ٹھہرے باپ
 آئندہ زمانے لد گئے جب زمانی بیگم کو وجہ صدر الدین
 کی عقل و فہم کی شہرت خلع بھر میں تھی۔"
 پان منہ میں رکھ کر ان کے غصے کو کچھ قرار آیا تھا۔



"ہاتھ ماتھے پر رکھ کر اسٹاف کا اظہار کیا۔" وہ آئے گھر
 ہمارے خدا کی قدرت پر ہم کو گھبراہٹ نہیں آئے۔
 "تاج بیگم نے اسے گھورا۔" انہیں
 داوی کے سنے ہوئے چڑھے ورنہ سچ مجھوتے نظر آتے
 اور سچ لپٹے ہوئے نظر آتے۔ بی بی لایا نے باک لڑکیوں کا بول
 بے تکلفی سے میرے بچوں کے متعلق پوچھا بالکل
 پسند نہیں۔ اس کو سمجھا دینا۔ آئندہ یہاں آنے کی
 غلطی نہ دہرائے۔ اپنی داوی کا کیا ہے نا؟

"تاج بیگم نے پتا ہے۔ کو کونٹ کی طرح ہیں بالکل اور
 سے سخت اندر سے بالکل نرم۔" اس پر قطعاً اثر نہ
 تھا۔

"چل جائے گا پتا۔" وہ جل کر کمرے سے نکل
 گئیں۔

"ہائے ہائے لہائی جان۔" اس نے جشید کو بازوؤں
 سے پکڑ کر پورے کمرے میں گھما ڈالا۔ "یہ گلیاں یہ
 چو بارہا یہاں آنا پھر دوبارہ۔ آپ کو تو خبری نہیں کیا
 قیامت گزر رہی ہے مجھ پر۔"

گول گول گھومنے سے جشید کا سر چکر آ گیا اور جشے
 کے پیچھے اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ وہ بیڑ پر بیٹھ کر

لے گئے تھے۔

”باجا! آپ کہیں تو رہ سہے۔ میں آپ کو لے رہا ہوں۔ دو روپے کی شیشی ہے۔ آپ آزما کر دیکھ لیں۔“

”نہیں میرے دوست۔“ اس نے مایوسی سے سر جھٹکالیا۔ ”ان آنکھوں میں اب آنسو ہی رہتے دو۔ انتظار یا کر کر کے اب یہ بے نور ہو چلی ہیں۔ اب کوئی سرمہ کچھ نہیں کر سکتا۔“

”یہ آنسو ہیں کہاں بھائی جان؟“ اس نے بغور بھائی کا چہرہ دیکھا۔ ”بالباب خشک بڑا ہے۔ کناروں پر کچھ جمع ہے۔ خوابشوں کے منہ ڈک ابھی بھی پھرنے لگا ہوا ہے۔ دیتے ہیں۔ آپ بے فکر رہیں۔ عشق کے اشتیاق سے لبالب بھری یہ آنکھیں اس قدر جلد بے نور نہیں ہو سکتیں۔“

شادی کے قابل لڑکیاں جواری اور بی منزل پر کبھی بکھار قیام کرتی ہیں۔“

جشید کی آنکھیں جلدی جلدی چھلکنے لگیں۔ لب بھڑبھڑانے لگے۔ خیریت بڑا شانت چلا آئی۔

”تمہارے کفرانِ نعمت کرنے لگا تھا۔ تمہارا بہت شکر یہ کہ تم نے مجھے صحیح وقت پر جو نکال دیا۔“

جند معنی خیزی سے اس کا دانا مارا۔

”لیکن میرے پیار یہ بھی تو سوچو جو دنیا اچھا لگتا ہے کہ چھوٹا بھائی محبت کی رنگین کہانی کا آغاز کر ڈالے اور بڑے بھائی کے دل کا صفحہ بے رنگ و سادہ ہی رہ جائے۔ آخر تمہیں میری زندگی کے ادھورے پن کا کچھ احساس ہونا چاہیے۔ اس بے رنگ کیفیت کا کچھ تدارک کرو۔“

”نہ ان آنکھ میرے دل کی آواز پہنچانے کی کوئی تدبیر کوئی سبیل کرو۔“

”کہیں تو ان کے کمرے میں وہی ”لاؤڈ اسپیکر“ فٹ کروا دوں؟“ اس نے آنکھ ماری۔ ”یہی آواز پہنچے گی آپ کے دل کی کہ ایک زمانہ سنے گا۔“

”نہیں نہیں۔“ وہ گھبرا گیا۔ ”یار! مجھے اظہار محبت

بانیے گا۔ لیکن وہ ہے کون؟ کہاں مل سکتی تھیں اور یہاں کس لیے آئی؟“ اس کی کے متعلق دریافت کرنے کے جس نے اسے جکینے لگا۔ حرکت پر بہم ہونے سے باز رکھا۔ وہ ٹھوڑی پر آیا ہوا جکینہ درخت کے نیچے لگا۔

”بانیے؟“ ”جکینہ؟“ ”خان؟“

”بانیے؟“ ”بانیے؟“ ”بانیے؟“

”بانیے؟“ ”بانیے؟“ ”بانیے؟“

”بانیے؟“ ”بانیے؟“ ”بانیے؟“

”بانیے؟“ ”بانیے؟“ ”بانیے؟“

”بانیے؟“ ”بانیے؟“ ”بانیے؟“

”بانیے؟“ ”بانیے؟“ ”بانیے؟“

”بانیے؟“ ”بانیے؟“ ”بانیے؟“

”بانیے؟“ ”بانیے؟“ ”بانیے؟“

”بانیے؟“ ”بانیے؟“ ”بانیے؟“

”بانیے؟“ ”بانیے؟“ ”بانیے؟“

”بانیے؟“ ”بانیے؟“ ”بانیے؟“

”بانیے؟“ ”بانیے؟“ ”بانیے؟“

”بانیے؟“ ”بانیے؟“ ”بانیے؟“

”بانیے؟“ ”بانیے؟“ ”بانیے؟“

”بانیے؟“ ”بانیے؟“ ”بانیے؟“

”بانیے؟“ ”بانیے؟“ ”بانیے؟“

”بانیے؟“ ”بانیے؟“ ”بانیے؟“

”بانیے؟“ ”بانیے؟“ ”بانیے؟“

”بانیے؟“ ”بانیے؟“ ”بانیے؟“

”بانیے؟“ ”بانیے؟“ ”بانیے؟“

”بانیے؟“ ”بانیے؟“ ”بانیے؟“

”بانیے؟“ ”بانیے؟“ ”بانیے؟“

”بانیے؟“ ”بانیے؟“ ”بانیے؟“

”بانیے؟“ ”بانیے؟“ ”بانیے؟“

”بانیے؟“ ”بانیے؟“ ”بانیے؟“

”بانیے؟“ ”بانیے؟“ ”بانیے؟“

”بانیے؟“ ”بانیے؟“ ”بانیے؟“

کرنا ہے۔ خطبہ نہیں پڑھنا۔ کوئی اور ترکیب کرو۔“
 ”اچھا سوچنا پڑے گا۔“ اس نے تھوڑی کھجائی۔
 ”وہ بھائی جان یاد آگیا۔ مجھے پچاس روپے چاہیے تھے۔
 جیب میں پھٹی کوڑی نہیں ہے۔ سوچتا ہوں کھل شام
 خجستہ کو کولڈ ڈرنک پلاؤں۔“

”ہاں ہاں۔“ اس نے گھبرا کر جیبیں
 ٹٹولیں۔ ”لیکن یار! دو کولڈ ڈرنکس کے لیے تو میں
 روپے بھی کافی ہوں یہ تم پچاس روپے کیوں مانگ رہے
 ہو؟“

”بھائی جان، کوئی ٹپ وغیرہ بھی تو دینی پڑ جاتی ہے۔
 آپ کو ان معاملات کا کیا پتا؟“
 ”آہ!“ اس نے بیٹے کی جیب ٹٹولتے ہوئے یکایک
 دل تھما۔ ”یہ کیسی چوٹ کی ہے ہیلو بھائی۔ اب چار
 پیرہنی کو قمار نہ آئے گا۔“

”آپ پیسے دیں بھائی جان! اس قدر جذباتی ہونے
 کی ضرورت نہیں۔ وہ خبر سنا گئے چار ہاوں کہ چار تو کیا
 آٹھ دینی سولہ پیر آپ مسرت کئے ناچتے پھر س
 گے۔“

”اچھا! آج بکٹے ہوئے کھانا کھاؤ۔“
 ”موصفد کی کبوتر؟“

”آپ کو ڈانس کی اتنی جلدی ہے؟“ وہ شرارتی ہوا
 پھر اس کے بڑے تیور دیکھ کر جلدی سے انصافیت کی
 جولائی میں آگیا۔ ”وہ میں آپ کو بتا رہا تھا کہ ”غزل نیوز
 ایجنسی“ کے مطابق بیویوں حسینا میں ہفتہ بھر کی چھٹی پر
 کل پہنچ رہی ہیں۔“

”سچ کہہ رہے ہو میرے بھائی؟“ جمشید نے جوش
 جذبات میں اس کا گریبان دونوں ہاتھوں سے پکڑ لیا۔
 جنید نے اس کی جیب سے جھانکنا نوٹ نکال لیا۔
 ”آپ کی قسم۔“

”میں آؤنی آؤنی جاؤں ہوا دے نال۔“ جمشید کے
 گلے پر اڑائیں بھرتا وہ گھر کے نکل گیا۔

”ارے شکورہ! یونی تو مائیں اپنی بیٹیوں کو
 آٹھ کلو کے کرتے نہیں پہناتی تھیں۔ کوئی بھی
 راز تھا نا اس کے پیچھے؟ ہار پڑے آج کل کی بیٹیوں
 بیٹیوں کو۔ کلیوں والی قمیض تو بورد کی بات ہے۔
 والی شلوار بھی گئی۔ موٹی موٹی پنڈلیاں کے بھلی
 ہیں۔“

”پان؟“ ڈاؤنی اچو نکلس۔ ”ارے شکورہ! تم
 زیادہ بیان نہیں کھانے لگیں؟ پچھلے ایک مہینے میں
 تھکانا پیسہ پایا ہے۔ خیر!“ انہوں نے مارے باز
 جی سے پاند آن کھولا۔ ”بے میں مجھے عار نہیں ہے
 یہ کم بخت کوئی کام کی چیز بھی نہیں، جو بیکری کی طرح
 جگلی کے جارہی ہو۔ اچھا یہ لو۔“ انہوں نے بال
 ہاں تو کیا کھڑی ہوئی تھی؟

”آپ؟ آپ وہ؟“ انہوں نے جان بوجھ کر
 منہ ان کی جیب بھری۔

”اب بار بار! اپنی داستان سنا رہی تھی
 سمجھیں۔ ارے میں یہاں تخت پر بیٹھی اس ”فنی“
 سے ذرا باتیں پوچھیں، بھال ہے جو اس نے میری
 ایک بات کا جواب دیا۔ تاج کو ”فنی“ کہنے کے
 چلتی بنی۔ آج کھل کی چھوڑیوں کو کچھ بزرگوں کا کانا
 ہے۔“

”لو کے اٹھو پوچھا آپ نے؟“ شکورہ بی نے یک
 نکل کر ادھر ادھر دیکھا اور راز دارانہ انداز میں پوچھا۔
 ”ارے پوچھ لیں گے۔“ انہوں نے کبھی
 اڑائی۔ ”کھانا لے کر کے ایسے نہیں شکورہ! معصوم بچے
 ہیں وہ غریب کچھ نوٹ لے لیا تھا اس سے۔ بڑی بولی
 ضرورت ادھر۔ کیا کہتے ہیں۔ ارے جہاں ”میسور“
 سکھے جانا ہے۔ حالانکہ باپ نے کبھی کی نہیں کی۔
 میرا قطب الدین بڑا خیال رکھتا ہے اپنے بچوں کا پھر
 بھی ضرورتیں ہوتی ہیں بچوں کی۔ وہ ”ٹینس“ گھر
 پہنچ گئی پیسے واپس لے۔ انکلی پر چالیوں بھاری تھی

یہاں آکر نہ خود بخود کہتی۔

جس کو جان بچانے کا کوئی طریقہ سمجھ میں نہ آیا۔
تا چار گر دن کھجا آدھ ان کی پاس جا بیٹھا۔

”ای۔۔۔ کھانا۔۔۔ بھوک لگی ہے۔“ اس نے واہی
جان کا دھیان پٹانے کی کوشش کی۔

اس کی آواز سن کر جشید بھی چلا آیا۔ وہ بھی تخت پر
چڑھ گیا۔

”پڑھائی اچھی کرتے ہو؟“ انہوں نے پوتے کو
منگھوک نگاہوں سے گھورا۔

”دلیری پیاری واہی!“ وہ پھرتی سے ان کے پاس

ہے ہم اس کا کرب دیکھنے کو بیٹھے ہیں۔ گردن میں
بیل چٹائی کے چندے کی طرح کٹا ہوا کپڑا لپیٹا
کسی ہونی تو یہ ارے بیل کمرہاری بھی تھی لیکن
بیل ہے جو کسی کو زندگی بھر خبر ہوتی ہو۔ سوائے
نہارے ابا کے۔ ان کی تو بیٹی میں سا جاتی تھی سیری

کہتے۔ ”مگر یہ ہے ابا میاں؟“ شکورہ بی کو غشی محسوس
ہوتی۔

”ارے ہمارے شرمناک“ صدر الدین جنت
رکائی۔ ”واہی نے چنگلی پر سے چونا چاٹا۔“

”چھابی بی جان میں اب چلوں۔ گھر پر لڑکیاں اکیل
ہیں۔“

شکورہ بی داستان کی بے رحمی سے آتا کر اٹھ
کھڑی ہوئیں۔ اب بھلا لڑکی کا محض جلیہ کہاں تک

سنے جاتیں۔ واہی اپنے پوتے کو تو صاف بچا کر لے گئی
تھیں۔ داستان میں بچی مفقود تھی۔

”جانتی ہو؟ اٹھا جاؤ پھر آنا خیر لے ایک تو یہ پان
بت مٹے ہو گئے۔“ جانواری کو خیال ہی لگا یا، م نے

کس کام کا موازنہ جان بچاؤ میں لیاں پیہ لگا گئی۔
شکورہ بی ٹانگے بھوں چڑھا کر زنجبست ہوئیں۔

واہی داستان کے نچلے حصے سے ریزگاری نکال کر سننے
لگی تھیں۔

”الوئی شوخ سی دھن بجاتا وہ بے حد خوشگوار
موڈ میں گھر میں داخل ہوا تھا۔“

ہیار باش پا کر اس کی شوخی اچھا ہو گئی۔ کتابوں کو
سنبھالنے میں مشغول ہو کر وہ ان کے قریب سے

گزرنے لگا۔

”ارے او میاں چھیلے۔“ اپناٹ وار آواز پر وہ گڑبڑا کر
رک گیا۔

”وہ واہی جان۔۔۔ اودھ۔ السلام علیکم۔“
”و علیکم السلام۔ کہاں بچتے بچاتے نکل رہے ہو؟“

رضیہ جمیل کے شاہکار افسانے
بدریا بھس گئی اس پار

شائع ہو گیا ہے

قیمت 150 روپے

اس کے علاوہ 2 مکمل ناولوں کے
ایڈیشن شائع ہو گئے ہیں

اک گھروندہ برف کا 300 روپے

سیاگر وریا بادل بوند 300 روپے

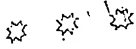
منگوانے کا پتہ

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

37 اردو بازار کراچی

”کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی۔“

جشید حیرانی سے آنکھیں پھاڑے بھائی کی سمت دیکھ رہا تھا۔



آگیا۔ ”صبح و شام دن رات کتابیں کتابیں اور کتابیں۔ صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا۔“
”ہوں۔“ انہوں نے چپٹے کئے عقب سے اسے دیکھا۔ ”وہ نازنین کل تمہارا پوجتھی پھرتی تھی۔ وہ کون ہے؟“ جید نے کچھ نہ سمجھنے کی اداکاری کرتے ہوئے کان کھجایا۔

”یہ بڑی چہرہ لوگ کیسے ہیں؟“ اس نے جشید سے پوچھا۔ ”غیر وہ مشہور ادا کیا ہے؟“
”ناس بنے! ٹھیک! ٹھیک! بول۔“ بالآخر اسے ایک ادھمو کالا۔ ”کیوں راہ و رسم بڑھائی ہے تو نے اس سے ہڈیاں پانگنے کو کوئی مرد بچہ نہیں ملا؟ لڑکی کے سامنے فقیر کیوں بناؤ؟“

”بنا کر فقیروں کا ہم بھیس غالب!“ اس نے آہ بھر کر جھکڑ بھلائی۔ ”تمہارے اہل کرم دیکھتے ہیں۔ لیکن پیاری دادی اٹلاؤں تو اس نے مجھ سے مانگے ہیں۔ میری رات رات بھر کر لیا کرتی ہے کس نے آپ کو اغلاط فیہ کیا ہے؟“

”تیری ماں بھی کہہ رہی تھی کہ تو نے اس سے ادھار رقم لی ہے۔“ وہ جھپٹتے ہوئے لپکے لپکے برہنہ۔ ”پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے گھرے برہنہ۔“
اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ ”آوی کوئی ہمارا دم تحریر بھی تھا؟“

”اچھا اب آئے گی تو میں خود پوچھوں گی۔“
”انشاء اللہ کہیں کی۔ کہہ گئی ہے پھر آئے گا۔“

”کہ خوشی کے منہ من جانے اگر اعتبار ہوتا۔“ اس نے سر آہ بھری۔

”اور مردود! اچھے شرم نہ آئی ایسی بے لک لڑکی سے دوستانہ کرتے تے!“ اسے پھر ایک دو ہنسر سے نوازا گیا۔ ”گلے میں بالشت بھر کر وہاں پاندھ آئی تھی بے شرم۔“

”ہائے!“ جشید نے آنکھیں گول کیں۔ ”اس چار گرہ پکڑے کی قسمت غالب!“

”مردار! کیا کبے جا رہا ہے؟“ وہ غصہ ناک ہوئیں۔

”یار جشید!“ وہ خوشامدی انداز میں اس کے پاس بیٹھا۔ ”اب یہ اتنے اچھے اچھے شعر کہاں سے یاد کیے؟“

”ہائے بھائی جان!“ اس نے سر کھجایا۔ ”میں کہیں اور یہ وہاں کہاں۔ نازنینوں کو متاثر کرنا بھی کوئی آسان کام ہے؟ غالب کا جگر خونم خونم ہو گیا۔ ذرا دیوان اشعار دیکھیے۔ ہفتہ بھر اسے ہر کھیا رہا ہوں تب کہیں جا کر ایک دو غزلیں دینی ہیں۔“

”تم نے تو رٹ لیں یار! میرا کیا ہو گا؟“ وہ مایوس ہو کر کہنے لگا۔ ”میرے تو بچے ہیں۔ گھر کے شیر کا حلیہ یاد نہیں۔ آنکھیں بند کر کے سوچوں تو بھائی جان میں آجاتی ہے۔ میں ایسے شعر کہاں یاد رکھ سکتا ہوں؟“

”تو آپ کو یاد کرنے کی ضرورت کیا ہے؟“ اس نے براہ منہ بنایا۔

”ارے واہ۔ خود تو غالب کا دیوان یاد کر رہے ہو کہ مجھ سے پوچھتے ہو کیا ضرورت ہے؟ تم اس خستہ خاں غالب کے شعر سناؤ اور میں اپنی شمو کو کچھ نہ سناؤں۔“
”آپ کی شمو؟“ وہ اچھا اچھا شمشاد بیگم کا زار کر رہا ہے۔ ”آپ آپ اسے موسم کا حال سنائیں۔“

”بھائی جان! اپنی دادی والے روز بتاتے ہیں؟“

”میرے پچاس روپے لا فوراً واپس کرو۔“ جشید طیش آ گیا۔ ”اور اس سے پہلے والے بیس روپے تم ابھی نکالو۔“

”اوہو ہو۔۔۔ بھائی جان! میرے پیارے بھائی! تو خفا ہو گئے۔ میں تو یوں ہی مذاق کر رہا تھا۔ اچھا تو آئی شمو کو شعر و شاعری سے مرعوب کرنا چاہتے ہیں تو اس میں کیا مشکل ہے؟ میں آپ کو ایک ساڑھ سے پر آدس اچھے اچھے اشعار لکھ دیتا ہوں۔ ساڑھ لے لے ملے تو ادب کیجیے یوں۔“

اس نے ایک خاص ادا سے بال جھٹک کر انگلیاں
 ماتھے سے لگائیں۔
 "دیکھن یا راناؤں کسے؟ تمہاری وہ جھنجھٹہ خان تو
 روز انٹینیوٹ میں لپتی ہے تمہیں۔ شمو تو کبھی
 پیرھیوں پر بھی نہیں ملتی۔" وہ ہنسی سے بولا۔
 "چھانویہ بات ہے؟" اس نے کچھ دیر غور کیا۔ "تو
 بھائی اجاں! آپ تو یوں بھی سولہویں صدی کے رومیو
 ہیں۔ انظارِ محبت کے لیے طریقہ بھی فرسودہ اختیار
 کیجئے۔ آپ کی عقل و ذراست کا رد بھی رہ جائے گا،
 جس نے تمہارے طمانچے کا خوف بھی جاتا تھا ہے گا۔"
 "چھا!؟" حشید اس کے قریب آ بیٹھا، اور اس کی
 گردن میں بازو جھانپ کر کہا۔ "تو جلدی کہو میرے دانا
 دوست مجھے کیا کرنا چاہیے؟"
 "ایک عدد خط تحریر کیجئے۔ اس میں اپنی شکایت
 بائے رنگیں لکھیں، تعافیل بایں صفائی کا ذکر کیجئے دل
 غم غشت کا سراغ مانگیں، ایک ہاڑکی قصیدہ خوانی کیجئے۔"
 حشید نے اپنا بازو اس کی گردن پر سے نکال لیا اور
 اسے بڑی طرح گھورتے لگا۔
 "یار حشید! مجھے ہر قسم کے خطبہ کو حفظ نہیں
 لکھنا یا رانی آسانی بات بتا کر کیا کھولیں گی؟
 لکھنا یا رانی آسانی بات بتا کر کیا کھولیں گی؟
 "آہان بات سنو، اس نے کان کھجایا۔" آئی لویو
 سے آسان بات کوئی نہیں بھائی جان! سیدھا سیدھا
 لکھ بھیجیں۔"
 "نہیں یار تو سمجھ نہیں رہا۔ کوئی پھڑکی تحریر کوئی
 ایسی متاثر کن بات کہ بس تڑپ اٹھے خالم۔"
 "مرغ کی سالم کیجی (ہج) ہیں۔" وہ طنزاً بولا۔
 "نے جگر کے نام سے۔"
 "تھیں پیلے ہانگ لوں گا۔" اس نے دھمکی دی۔
 "میں مزید پیسے لوں گا۔" وہ بھی اکڑا۔ "سوروپے
 میں ایک عدد خط موبلیں منظور ہے؟"
 "سوروپے؟" حشید پریشان ہو گیا۔ "یار یہ تو بہت
 ہیں۔ پتا نہیں کتنے خطوں کی ضرورت پڑے یوں کرو سو
 روپے میں چار خط۔"
 "تیس خالی خالی منشی ہوں کیا۔" وہ بے رخی سے بولا

اور کتاب کھول کر بیٹھ گیا۔
 "چھا چلو دو خط۔ اب تو مان جاؤ۔"
 "ہوں!؟" اس نے غرے سے سر ہلایا۔
 حشید نے خوشی سے کھل کر اس کا کھل چوم لیا۔
 * * *
 "آئے لموسم رنگیلے سہانے جیا ناہیں مانے۔ تو
 چھٹی لے کر آجا بالما۔" غزل بے حد موڈ میں گنگناتی
 ہوئی پن میں کھڑی چائے بناری تھی۔
 باہر آسمان میں اپنے تخت پر براجمان بیخ سورہ رزقتی
 داوی کے کان کھڑے ہو گئے۔ انہوں نے چشمتے کے
 اوپر سے عقاب کی نگاہیں بنا کر پن کے دروازے کو کچھ دیر
 گھور کر گنا بند ہونے کا انتظار کیا، لیکن اندر اپنے کام
 میں منہمک غزل ان کے اندرونی تلاطم سے بے نیاز و
 بے خبر تھی۔ وہ غزل کی گنگناتی رہی۔
 "ہوں ہوں۔ ہوں ہوں۔" کلا! آخر داوی جان
 نے اپنی موجودگی کا احساس دلانا چاہا بیخ سورہ کے دوران
 گنگنا کر ان کیسے نزدیک آواہ کے خلاف بات
 کہی تھی۔
 "دیکھیں پھول کو بھورا چوم گیا۔"
 داوی جان کے چہرے کے تیشات غضب ناک
 ہوئے۔ ان کا زور دولا ہے بھائی! موقوف ہوا۔
 "میرا دل مستی میں جھوم گیا۔ کوئی میری خوشی کونہ
 جانتے۔"
 داوی جان نہایت غصے میں بیخ سورہ جزدان میں لیٹنے
 لگیں۔
 "مردار کہیں کی۔ ذرا ادھر آتو۔" انہوں نے
 کڑک دار آواز میں کہا۔
 غزل کونسل کے شور میں ان کی بات سمجھ میں نہ
 آئی۔ وہ اب ساس پین مانجھنے میں مشغول تھی۔
 "بڑے اڑناؤں سے رکھا ہے بلم تیری قسم۔ پیار کی
 دنیا میں یہ سلا قدم۔ پسلا قدم۔"
 اس کی کمر پر ایک زور دار دھنوکا پڑا۔ وہ اچانک
 افتادے ہو کھلا کر رہ گئی۔

”مردود نہیں کی۔ کانوں میں تیل نہیں ڈالا جاتا تبھہ سے؟ بھری بنی کھڑی ہے۔۔۔ مے گانے پہ گاتا۔ دے گانے پہ گاتا۔ میرا اندر رسول کا نام لینا تو بھر کر ڈالا تو نے نا تنہا۔“

وہ بے حد غضبناک ہو رہی تھیں۔ اندر آتی تاج بیگم نے بھی غزل کو گھور کر دیکھا۔
”کیا ہر وقت گانے گاتی رہتی ہو غزل؟ زبان کو دو گھڑی قرار نہیں ہے؟“

”اری تاج! گانا افسانہ بھی وہ گاتی ہے جس میں گھوم پھر کر اسی مردود کا ذکر ہوتا ہے۔ میں کہتی ہوں خدا خدا کر کے توفہ دیا گیا ہے گھر سے۔ شیطان تو اچھے پورا امتنا ذکر ہو گا تو پھر جلائے گا۔“

تاج بیگم اور غزل کے پیرے پر کچھ نہ سمجھ میں آئے تھے بالے اثرات پیدا ہوئے تھے۔
”میں افسانہ کا ذکر کروں گی یا داری؟“ وہ لڑکھائی سے ہوئے دینی آواز میں پوچھی۔
”میں تو آپ کی پسند کا گانا گارہی تھی۔ آپ نے ہی سیکھا تھا میں نے۔“

”اوسل امانی! میں ہی گنگنتا تھی۔“ انہوں نے اقرار کیا۔
”لیکن جب وہ مردود کا ذکر گھڑی سے کیا ہے میں نے اپنی پسند لپیٹ کر ایک طرف نہر کھدی۔“
”کیوں؟“
”وہ مجھے جارہا تھا کہ تاج بیگم نے ناک بھوں پر تھامی۔“

”اری ہر گانے میں تو بالم بالم کہتا ہے۔ زبان میں افسانہ خبیث کی ہستی آجاتی ہے۔“

غزل ابھی افسانہ کا بھول بھال زور زور سے ہنسنے لگی۔ تاج بیگم بھی مسکرائے۔
”خدا خدا کر کے تو وہ چھٹی پر گیا۔“ اس کی کچھ دیر کو گلو خلاصی ہوئی ہے نہ گایا کرو بالم بالم والے گانے۔“

وہ برہم داتے ہوئے کچن سے نکلیں۔
”کیا ڈراؤ کا ذکر کرے کوئی ایسے گھر میں۔“

”گورے گورے۔۔۔“ وہ اپنے کچھوڑے۔۔۔ کبھی انہیری گلی آیا کرو۔“ غزل شرارت سے گنگنتا ہوتے اندر کو بھاگی۔ وادی نے جل کر جوتی اٹھانے کو ہاتھ

بروہیا تپ تک وہ بھاگ چکی تھی۔
وادی نے برہم داتے ہوئے اپنا اندام گھول لورینہ کی سوکھی کھلیا پیچھی سے مگر نے لگیں۔
”نفسہ میں کیا۔ چاچی جی۔ اسے بولنا۔“
”کھولیں۔“ (میں نے کہا) چاچی جی یہ دو لڑکوں کو دیں۔)

وادی جان نے حیرت اور خفا سے اصرار کر رہا۔
”گویا آواز کا سبب اچھوٹنے کی کو شش کی۔“
”اوجی۔۔۔ اچھے اچھے۔۔۔ میں اچھے آئے۔“ (انہوں نے اصرار کیا۔)

وادی نے ہاتھ کا چھتا بنا کر اوپر کی سمت رکھا۔
خورشید علی صاحب کے بڑے بھائی عرف چاچی کی روایتی لباس میں بلوس وہاں کھڑے ہاتھ ہلا رہے تھے۔
”کیوں حلق پھاڑا ہے؟“ وادی برسیں۔

”او چاچی جی۔۔۔“ (بولنا یا ہرواں بندے کھول دیں۔) (چاچی جی میں بھاڑا ہوں باہر سے روانہ بندے۔) (کھول دیں۔)

”اچھی جی۔۔۔ اسے بولنا۔“ انہوں نے بے بسی سے کہا۔

”اچھے بولنا۔“ چاچی بولی یا بول۔ کوئی ایک بات بولو۔ کبھی چاچی کہتا ہے کبھی بولنا کہتا ہے۔ ارے بھائی میں اسی بدھتی نہیں۔ تم سے دو چار برس ہی آگے ہوں گی۔ لو تیاؤ بھلا۔ سفید بال ہیں بڑھے کے۔
بن (اچھے۔)

”اوسنیں! میں اچھیاں بولنا۔“
”ارے کون سی بولنا کہتا ہے؟“ وہ جھلا گئیں۔

”اندھ سے نہایت تیزی سے تاج بیگم برآمد ہوئیں۔“
”رہنے دیں آپ۔“ انہوں نے ساس کو بدھتی سے کہا۔ ”وہ بے چارے اور بند ہیں۔ کام دلایا کہ اپنے بیٹے پر وازے کی گندھی لگا گئی ہے۔ دوسری جانب نور بانو آواز میں رہی ہیں۔ یہاں سے بھائی صاحب

ہوں میں۔ اللہ رکھے۔ ہاتھ بیروں سے سلامت ہوں کسی کی محتاج نہیں۔“

”نہ جی میں کیا پوڑھیاں وامسلہ اے!“

”کیا بوڑھی بوڑھی کیے جاتی ہو؟“ داوی

جھٹا گئیں۔ ”خود ہی نو جوان ہے کم بخت۔“

آگے وہ منہ میں بربرائی تھیں۔ وہ ان کی سیڑھیوں

کی جانب بڑھی تھیں جو ان کے کھن میں اترتی تھیں

ان کو آتا دیکھ کر نوربانو کا چہرہ کھل اٹھا تھا۔

”تاج ذرا اڑھر آؤ بھی۔“ قطب الدین صاحب نے کمرے سے آواز دی تھی۔

تاج بیگم دوپٹے کے پلو سے ہاتھ پونچھتی کمرے میں

داخل ہوئیں۔

”اگر تیرے بھائی کو لڑائی سے بھڑا جاتا ہے۔ سرور کی

گولی لا کر دو۔ ایک کپ چائے بنا دے۔“

”جی اچھا!“ وہ فکر مندی سے بولی۔ ”گولیاں تو

ختم ہو گئی ہیں۔ میں جشید سے منگوائی ہوں۔ تب

آتا ہے۔“

”وہ آتا ہے تو لاؤ لاؤ لاؤ۔“ کسی ڈھنگ

کے بندے نے کہنا شروع کیا۔ ”وہ کرا ہے۔“

”کیجئے۔ اب اتنے بھی گھر گزرے نہیں ہیں۔“

آپ کو تو ہمیشہ اپنی اولاد میں کیر لے ڈھائی دیتے ہیں۔“

”میں ابھی لے آتی ہوں گولی اور

چائے۔“

وہ مڑ کر کمرے سے نکلی تھیں۔

”جشید۔۔۔ او جشید۔“

”جی امی۔“ وہ بینک درست کرنا چلا آیا۔

”تمہارے ابو کی طبیعت ٹھیک نہیں۔ سرور سے

بے حال ہو رہے ہیں۔ دوڑ کر گولیوں کا پتہ لے آؤ

میڈیکل انشور ہے۔ میں تب تک چائے بناتی

ہوں۔“

”جی اچھا۔“ اس نے سعادت مندی سے سر ہلایا۔

”جلدی آنا۔ دیر نہ کرنا۔“

چلا رہے ہیں۔ آپ کو تو کوئی بات سمجھ میں نہیں آتی۔

میں کھول کر آئی ہوں ان کی کھنڈی۔“

”لو۔ سب فنکار ہیں یہاں۔“ داوی سڑجھک

کر پان پر اطمینان ہے کتنے کا کوٹ کرنے لگیں۔

”اب میں کیا جانوں؟ سیدھی بات نہیں کرتا۔ بوا بوا

کیے جارہا ہے۔ ننھا میاں۔ بھائی شیخ سے بول یا ہر سے

گندازا ہے۔ کھول دو ہم سمجھیں بھی باز ایک ڈھونڈ

لیٹ کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ حواس تو ویسے ہی خط ہونے

تگتے ہیں نگاہ پڑتے ہی اللہ مغفرت کرے جنت مکانی

ملا بہ الدین صاحب کی کیسے نفیس آوی تھی۔“

”کیا کرتی ہو نوربانو؟“ داوی جو بڑی دیر سے رینگ

میں آئے دکھائی دیتی نوربانو کی سرگرمیوں کو بھانپنے کی

کوشش کر رہی تھیں۔ بالآخر نہ سکے۔

اتنا اندازہ تو انہیں ہو گیا تھا کہ وہ کوئی اہم کام

سراجم دے رہی تھیں۔ ایک مخصوص قسم کی خوشبو

بھی ان کی ناک کو گند کر چا چکی تھی۔ سو اب وہ بے

تاب ہو کر انہیں بیکار ہی پڑی تھیں۔

نوربانو ان کی بیکار پر خوش خوش رہنے لگی تھیں۔

”ماں جی! انہاں دا چار پونڈی آں۔ نالے مریاں

تے لیہوں وی آں۔“ (ماں جی! آہم کا چار ڈال رہی

ہوں ہاتھ میں مریجیں اور لیہوں بھی ہیں۔)

”اچھا اچھا! میں بھی کھٹی کھٹی خوشبو آ رہی

ہے۔ کیسے ڈالتی ہو کوئی خاص ترکیب ہے کیا؟“

”ماں جی! تسی آجاو نا۔“ (انہوں نے خوش دلی

سے کہا۔)

”اچھا!“ داوی جاننے لگی بھر تو قف کیا۔ ”چلو تم

اتنا اصرار کر رہی ہو تو آجانی ہوں۔ ویسے سیڑھیاں

چڑھنا مشکل ہے میرے لیے۔“

”آہو جی۔ پورھیاں (سیڑھیاں) داتے مسئلہ

ہے!“ (ماں جی۔ سیڑھیوں کا تو مسئلہ ہے۔)

”خیر!“ داوی برامان گئیں۔ ”مٹی بوڑھی ابھی نہیں

اتنے تھک گئے ہیں۔ ہلا تک نہیں جاتا۔

”کیوں نہیں کیوں نہیں۔ میں سب لے جاؤں گا۔“

اس نے دونوں ہاتھوں میں بڑے بڑے اٹیچی کیس اٹھالے۔ شمشاد نے جلدی سے سفری کولر اس کی گردن میں لٹکایا۔ ارشاد نے ہینڈ بیگ اس کے کندھے پر رکھ دیا۔

”یہ کیس؟“ ارشاد نے پوچھا۔

”ان کے سر پر رکھ دو۔ کیوں جشید صاحب؟“

”بالکل بالکل۔۔۔ اس کی پچھلی چھٹی چھٹی آواز آئی۔“

”ہاں ہاں جوان! بگڑے آدمی ہیں۔ کوئی اتنے سے سامان سے ان کی چیخ شہوڑا ہی ٹوٹنے والی۔“ چھوٹی ارشاد نے ٹکڑا لگا گیا۔

”اور“ ”تکڑے“ کے الفاظ نے اس کی چکی کمر کو کافی سہارا دیا۔ لیکن چشمہ حسب معمول برک کرناک کی پھنگ پر جا پھنچا۔

”میرا چشمہ۔۔۔“

”تیار ہے؟“

”ارشاد نے اس کی چشمہ لٹکائی۔“

”مم۔۔۔ میں دیکھوں گا کیسے؟“ اس نے پھول ہوئی سانسوں میں پوچھا۔

”ہم لیے چلے ہیں۔ جناب! دیکھیں آپ کا بازو۔“

”کیا لیا۔“

”جی جی ہی ہے۔۔۔ اس کی ہنسی نکلی۔ ”مم۔۔۔ مجھے گدی گدی ہوتی ہے۔“

”ہمیں بھی تو ہو رہی ہے ہم کوئی ہنس رہے ہیں؟“

یہ ارشاد بھی جس نے مسکراہٹ مشکلوں سے ضبط کی ہوئی تھی۔

دونوں جانب سے اس کے بازو تھام لیے گئے تھے۔

بوجھ اٹکا سارا احساس ہوا ہو گیا تھا۔ شرمائی شرابی مسکراہٹ کے لٹا تھا۔ کمر لپکا مٹکا کر اس نے میڑھیاں طے کیں۔

”ای جی! ایسیں آگئے۔“ ارشاد نے آواز لگائی۔

”ہائے! ہائے! میں صدقے۔۔۔ میں واری۔ میری

”میں بھی گیا! اپنی تیا۔“ وہ تیزی سے باہر کی جانب

بڑھ گیا۔

گیٹ سے باہر نکلتے ہی وہ پتھر کا بت بن گیا۔

باہر کھڑی انکیسی میں سے تین عدد حسینا میں برآمد ہو رہی تھیں۔ جشید کا اوپر کپاس اس اوپر نیچے کا نیچے

رہ گیا۔ اس کے دل میں سب سے پہلا خیال یہی آیا،

کہ دوڑ کر جائے اور جشید کو بلا لائے پھر اس نے اپنا خیال خود ہی رد کر دیا۔ جشید کی موجودگی میں اسے ہمیشہ

صفر مار کس ملتے تھے۔

ارشاد کی نگاہ اس کے کھلے ہوئے منہ اور پھٹی ہوئی آنکھوں پر پڑی۔ وہ بے ساختہ ہنس دی۔ اس نے

انکیسی والے کو پیسے اپنی شمشاد سے کچھ کہا۔

تینوں مڑ کر اسے دیکھنے لگیں۔ وہ بے طرح شرما

گیا۔

”جشید! صاحب! ابی! جتنے ہیں۔ ذرا ادھر

آئیں۔“ غالباً وہ شمشاد کی طرف اشارہ کر رہی تھی۔

جشید کے ہاتھوں کے طوطے اڑا دیے۔ اس نے

دائیں دیکھا پھر بائیں پھر ہونق بن سے آسمان کو دیکھا۔

وہ تینوں قہقہہ مار مار کر ہنسنے لگیں۔

”ہم یہاں ہیں!“ وہ کورس میں ہونق بن سے

وہ پھر شرما پھر کھانچا اپنا چشمہ اتار کر پھر سے پھینکا۔ اور

پھر دھیرے دھیرے قدم اٹھاتا تین تک پہنچا۔

”کیسے ہیں جناب؟“ بے تکلفی سے پوچھا گیا۔

”جی میں۔۔۔ جی میں۔۔۔ جی میں۔۔۔“ ان کی خوشی سے آواز

اس کے گلے میں اس طرح پھنسی کہ پورا جملہ باہر نہ

آسکا۔ قہقہہ پھر لگا۔

”جی! جی! جی! اچھا۔ ٹھیک ہے ہم پہنچ گئے۔ آپ

بست اپنے چلے ہیں۔“ بڑی شوخی سے بولی۔

جشید نے آنکھیں پٹپٹائی اور اثبات میں سر

ہلایا۔ اس کا دل بلیوں اچھل رہا تھا۔

”کیلا کام ہے۔ کریں گے؟“ انداز دلبری سے

پوچھا گیا۔

سر پھر فائٹ اثبات میں ہلا۔

”یہ ہمارا سامان اوپر تک لے چلیں۔ سچی سفر سے

نریاں جتنے دیے اپنی آٹھ

نور یا خوشی سے بے حال ہو کر آگے بڑھیں پھر
منہ تک کر رک گئیں۔ ”ہائے دے رہا ایس بے
چارے والی خالی کیتا اے؟“ وہ حیران نظروں سے
جشید کو دیکھنے لگیں۔ جبکہ ان کی ساری داوی جان کو
سانے بیٹھا دیکھ کر سب شوخی بھول گئیں۔ وہ شعلہ بار
نگاہوں سے اپنے پوتے کا حال دیکھ رہی تھیں۔
شمشاد دیکھا اور ارشاد نے فٹافٹ اپنا اپنا سامان

تھا۔ ”میرا چشمہ“ اس کے لبوں پر بلبلا ہوتا ہوا مسکرا ہوا
تھی۔ شمشاد نے جلدی کیے ہاتھ میں پکڑا چشمہ اس کی
آنکھوں پر لگا دیا۔ سب سے پہلے جو چیز اسے نظر آئی وہ
داوی جان تھیں۔ جشید کو اپنی بصارت پر رشک گزرا۔
اس نے جلدی اپنے چشمہ اتار کر صاف کیا اور پھر سے
لگا دیا۔ منظر حسب سابق تھا۔

”دوسری داوی“ آپ سیاتی کہا کر رہی ہیں۔
میں تو ان کا بیٹا ہوں۔ وہ میں جوان گھڑا آدمی نیچے گھڑا
تھا۔ آپ بوڑھی عورت ہیں۔ آپ کو بچہ بچہ
”کوڑ نکال گردن سے!“ وہ کوڑ نکال دار آواز میں
بولیں۔ ”بوڑھ جیل نیچے“

”کم بختی مارے ناس میں مراد شمشاد نے کی تھی؟“
داوی غصہ لپٹا تک ہو رہی تھیں۔
”وہ داوی میں تو ان کی بیوی ہے۔“ وہ منمنایا۔
”ارے قلی ہے تو مزدور ہے کیا ہے؟“
”وہ داوی میں تو۔“

”گدھا ہے گدھا ہے“ قطب الدین صاحب نے
کھڑا لگایا۔ ”پراپیوں کا بوجھ دھوٹا ہے۔ باب داوی کے
”ایسے حال ہوتا ہے اس کی بلا سے۔“
”میں داوی لینے ہی جا رہا تھا ابو جی! رستے میں
”دھس۔“
”ایسی بلا میں ہیں کم بختیں۔ میرے بچے کو خچر

بنا ڈالا۔ ارے تاج یا کل قلی لگ رہا تھا۔ قسم لے لو۔
پہلے تو میں پہچانی نہیں۔ چشمہ تک نہیں تھا چہرے پر
”سینچو لگ رہا تھا۔“

غزل منہ دبا کر فیس دی۔ اس کے ایک رکتا پرا۔
”میسمنی۔ فیس رہی ہے برا بھالی ہے تیرا۔“
”داوی آپ ہی تو مذاق بنارہی ہیں۔“ وہ برا سامنے
بن کر کندھا سہلانے لگی۔

”میں تو تیرے باوا کا بھی مذاق بنا سکتی ہوں۔ داوی
ہوں تیری۔ چل اٹھ، جا کر نہا۔ بال کیسے چمکت
ہو رہے ہیں۔ اور سن لو کہ۔“
انہوں نے جشید کو گھوڑا۔

”اگر آئندہ میں نے تجھے ان کا بوجھ دھو دے دیکھا تو
گلے میں رستی ڈال کر ان کے صحن میں باندھ آؤں گی۔“
”ان کے صحن میں؟“ اس کی باچھیں اس تصور
سے ہی کھل گئیں۔

پھر جلدی سے اس نے باپ کی طرف دیکھ کر گردن
جھکا لی۔

UrduPhoto.com

عشق و مزدوری عشرت گاہ کیسے خوب!
ہم کو تسلیم ہو جائی فرما نہیں
جشید نے ”دیوان غالب“ بن کر کہتے ہوئے کہا۔
”جشید جیسے زخموں سے اسے گھورا۔“
”کیا مطلب؟“

”مطلب یہ بھالی جان! کہ فرما کا کام عشق کرنا
ہے۔ مزدوری نہیں۔ عشق اور عشرت گاہ کی مزدوری
دو علیحدہ علیحدہ چیزیں ہیں۔ اب آپ کبھی شمو کی نگاہ
میں عاشق نہیں بن سکتے۔“

”یوں نہ کہو میرے بھالی۔“ وہ دل گداز انداز میں
بولی۔ ”گورنمنٹ میں فرما کی طرح ہی چشمہ مار کر اپنا سر پھوڑ
لوں گا۔“
”چشمہ نہیں تیشہ!“ اس نے تصحیح کی۔
”ہاں ہاں وہی وہ ہوتا کیا ہے؟ کہاں سے لٹا ہے؟“

نہیں؟“ جمشید نے حیرت سے چشمہ درست کیا۔
 ”میں اپنی بغل کی بات کر رہا تھا بھائی جان! فائل
 چونکہ میری ہوتی ہے اس لیے میری ہی بغل میں ہوتی
 ہے۔“

”تو وہ کیوں نکالتی ہے؟“

”تاکہ اسے بنے بنائے نوٹس مل سکیں۔ جو چیز اس
 کے پاس نہیں ہے وہ اس کو استعمال کرنے کے متعلق
 سوچتا بھی نہیں چاہتی۔“ اس نے سر آہ بھری۔
 ”اس کے پاس کیا نہیں ہے؟“

”جو آپ کے پاس بھی نہیں ہے اسے بنے بنائے
 نوٹس درکار ہیں۔“ انہی کو لکھے لکھائے خطوط کی طلب
 ہے۔“

”اور تمہیں کیا درکار ہے؟“ جمشید نے اسے

”آہ! اس نے سر آہ بھری۔“

”یک جاتے ہیں ہم آپ کے ساتھ
 لیکن عیار طبع خریدار کو دیکھ کر!

جمشید نے غصے سے سر جھکا۔

”غالب کو گھورا۔“ ”کوئی آسان سا شاعر تو ہوتا ہے تیار!“

”سلام داوی!“

”داوی! میں نے سخت پر گاؤ تکیے کے سہارے نیم دراز
 تھیں۔ بازو آٹھ گھول پر رکھے وہ سستی سے پیش او نگہ
 رہی تھیں۔ آواز پر اچھل بی پڑیں۔ سامنے بام کھڑا
 مسکرا رہا تھا۔“

”مہبت تیرے کی امردار!“ وہ اٹھ بیٹھیں۔ ”چلا آیا تو
 لبو ترانہ لے کر۔“

”ہی ہی ہی!“ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

”اب دراز کر ہمیں دن رات۔“ وہ چٹکی اٹھا کر
 بیزاری سے جھلنے لگیں۔

”میں پٹکھا جھل دوں داوی۔“ وہ خوشامد سے بولا۔

”نہ! المغاف رکھ ایک مرتبہ میرے کلن پر ماری

”اسے تو اپنے ابا جان سے درختے میں مالتا تھا خسرو
 نے ازراہ نہایت نیا غور عطا کیا: دم۔ آپ کو۔ کچھ
 خریدنے کی ضرورت نہیں۔ آپ کے جذبات اور
 کمزرت واقعات کو باریک بینی سے دیکھتے ہوئے پیش
 گوئی کی جاسکتی ہے کہ یہ کام آؤ خوں ہونے والا ہے۔“

”اچھا!“ اس نے جمشید کی بات قطعاً نہ سنی اور
 دُپٹے سے بولا۔ ”وہ کس طرح میرے بھائی

”دیکھتے جائے!“

”اتحاد خط کا کیا بنا؟“

”آپ کے پاس ابھی خط خریدنے والے لیے رقم
 کس ہے۔ فی خط پچاس روپے کی بات طے ہوئی

”تھی۔“

”تو راز ادھار کرلو۔“

”اس اظہار سے میں آپ کی محبت کی پیمائش کرنے
 سے پہلے ہی کاش دل لگا۔“

”اتنے سنگ دل بہت تو نہیں رہے بھائی!“ اس نے
 آواز میں رقت اور سوز پیدا کیا۔ ”وہ اظہار میں محض

چند دن کی رخصت لے کر آئی ہیں۔“

”ہائیں؟ اللہ تعالیٰ نے اسے؟“

”میں نہیں کہنے اپنے کالجوں کے! میں نہیں پھر لوٹنا
 ہے۔ کچھ دنوں میں آؤ پوری منزل پھر میرے دل کی طرح

خالی ہو جائے گی۔“

”آپ کی “دوبری منزل؟“ اس نے جمشید کی

لکھوڑی ملاحظہ کی۔ ”وہ تو پہلے ہی خالی ہے بھائی جان!

آپ کو کیا مغالطہ ہوا؟“

وہ بھنا کر رہ گیا۔

”مہتمم خود کو غالب پارٹ نو تو نہیں سمجھتے آگے؟ بہت
 اترار ہے ہو۔“

”میں کسی شاہ کا مصلحت نہیں ہوں بھائی
 جان!“ اس نے سر آہ بھری۔ ”مجھے خان کی
 دوستی نے میرا دیوالیہ نکال دیا ہے۔ دن رات ایک
 کر کے نوٹس بنانا ہوں۔“ وہ حسینہ ایک اداسے دلبری
 سے مسکرا کر بغل سے فائل نکال رہی تھی۔

تھی کبھی تو نہ تو کبھی مل گیا ہے کام میں۔
 ”جیہاں، ادی؟“
 ”اب تو گناہا ہمارا۔ تجھے کوئی پوچھنے والا ہے؟“
 چل بیٹہ ادھر ذرا اب بیروں کو۔ ”دادی اس کی چالپوسی سے کچھ راضی ہوئیں۔“

وہ بھٹ بھٹ پر بیٹھ گیا۔ ان کی ٹانگیں اٹھا کر اپنی گولہ میں جو رکھیں ’دادی پیچھے کواٹ کر لیں۔‘
 ”ہی ہی ہی دادی تم گئیں۔“ وہ گھبرا کر اسے ہنسی بھی گئی۔

گڑبڑیے پرانی ہوئی دادی چلا میں اپنا بابا۔
 ”میں نے سیدھا کر لیا۔“ ”یام نے لپک جھپک کر انہیں سہارا دے کر پھرے بٹھایا۔“
 ”چھڑی پکڑا میری!“

اس نے جلدی سے ان کی چھڑی اٹھا کر انہیں تھمائی۔
 ”مرد اسے پاس بیٹھے۔“ پے درپے کئی وار انہوں نے اس کی پسلیوں پر تپے۔

”ہائے اللہ! تم کیا باتوں میں لگے ہو؟“ وہ ہر ہزار پر اچھلا۔
 ”اے! تو تو بگولہ ہمارے کیوں پر۔“ انہوں نے تھک کر چھڑی پھینکی۔ ”میرے گا گیا۔“
 اندر سے غزل جھلجھلائی اور تاج بیگم شور مچا رہا ہر نکلے۔

”کیا ہوا؟ کیا وادادی۔“
 ”اے یام! جیشید کی باپچیں کھل گئیں۔“ تم آگے بڑھا۔
 ”ہاں! تو پھولوں کا بار ڈال اس کے گلے میں۔ گھر کے دھندوں سے جان چھوٹی۔“ دادی طنز سے بولیں۔

”شکر ہے یام تم آئے۔“ غزل نے ناک چڑھائی۔
 ”تیرے منہ کے تو خندق ہے۔“ دادی نے اسے گھورا۔ ”وگنی یام، یام کرنے۔“
 ”ذرا سا آرام کر لو تو یکن سنبھالو۔“ تاج بیگم کو اطمینان ہوا۔ ”چائے بنا کر برتن دھو لیتا ہوں۔“

”بس یہی کرے گا اب سب کچھ سب بھانجے ہوئے اس کے۔“ دادی بڑبڑائیں۔
 یام تو دیکھ کر سب ”میری“ ہو گئے تھے دادی کمر کر رہ گئی تھیں۔

ہم اپنے مانا کہ تعاقب نہ کرو گے جن خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک پیاری شئی!

سلام محبت (اول اول) پیش خدمت است! جیشید اپنے چشمہ شہادت کی انگلی سے پیشانی تک دھکیلا، اور ناک بھول چڑھائی۔
 ”یہ کیا لکھ دیا ہے؟ یہ تو خود میری! سمجھ میں نہیں آ رہا۔“

”آپ کو بعد میں شکر ہو گا۔“ وہ مصروف انداز میں بولا۔
 ”آجھا! وہ مطمئن ہو کر پھرے بیٹھے لگا۔“
 ”آپ بھگت میں میری صورت نقل ایجڈ“

”آپ ہمارے گھر میں آئیں گے یوں گا گلستان میں بہار چلی آئی ہو۔“ لیکن ابھی مشام جاں اس بہار کی خوشبوؤں سے معطر بھی نہ ہو پائی تھی کہ آپ بڑھائی کا ہانا کر کے ہم سے دور چلی گئیں۔

”یار! جیشید نے تحریر پڑھنا ترک کر کے پھرے چشمہ پیچھے دھکیلا۔“ یہ تو بڑی گاڑھی گاڑھی باتیں لکھ ماری ہیں۔ ”محبت“ تو بس پہل لائن میں ہے۔ وہ مجھے گی کیلئے۔

”بھائی جان! اے! اے! کتاب پر سے سراٹھایا۔“ ”لوکیاں ہمیشہ میٹر ہا میٹر ہا! تو اڑا تو اڑا! ظہار محبت پسند کرتی ہیں۔ سیدھی سیدھی بات انہیں سمجھ میں ہی نہیں آتی۔“ ”لیکن بات پسند کرتی ہیں۔ مبسم!“
 ”آجھا!“ وہ مبسم مسکرایا۔ ”پھر آگے بڑھوں؟“
 ”پڑھو پڑھو۔ جو سمجھ نہ آئے پوچھ لیں۔“

ہم تھے مرنے کو کھڑے پاس نہ آیا نہ سہی
آخر اس شوخ کے ترکش میں کوئی تیر بھی تھا
”یار جید!“ وہ پریشان ہوا۔ ”یہ مرنے مارنے کی
باتیں کیوں لکھ دیں یار! پیار محبت کی باتیں لکھو، عشق و
عاشقی کے قصے ہوں اور ایسے شوخ کی جگہ شمشادی لکھ دو
”یہ کیا حاج ہے؟“

”بھائی جان!“ جنید نے بین رکھ دیا اور اس کی
جانب متوجہ ہوا۔ ”میں نے پچاس روپے لے کر خط
آپ کے حوالے کر دیا ہے۔ اب آپ کی مرضی ہے جو
”ایئریشن“ کرنا چاہیں، کر سکتے ہیں اور انجینیئر طرح سوچ
لیں کہ شمشاد، بلی شاد اور ارشاد میں سے کیا لکھنا ہے۔
پہلا پہلا خط ہے انجینیئر سوچ سکتے ہیں، بعد میں کوئی
جانس نہیں۔“

”جیسا کہ“ وہ فکر مندی سے بولا۔ ”ہاں، پانچ روپے
نہیں یار! شمشاد ہی ٹھیک ہے، جیسا کہ جیسا ہی لکھا ہے
اور وہ ہے بھی سب کے لیے اور سب سے گوری۔“
”ٹھیک ہے پھر نامہ بر کے متعلق کچھ سوچا۔“

”یہ تو آپ کا نہیں ہے؟“ جنید نے کہا۔
”یہ تو آپ کا نہیں ہے؟“ جنید نے کہا۔

”نہایتیہ کے سر ہارنے کے لیے طے ہوئے سوچ
”اے آپ کو۔ وہ تو جلی جانے کی ہاتھ لکھی اور پیچھے
سے بذریعہ ایئریشن پہنچنے والا خط انکل خورشید علی یا
آئی نور بانوی کھ لیں گی۔ آپ نے شاید ان کے بچن
میں وہ مسالا پیسے والی کوئٹی اور اس کا پیسہ ڈنڈا نہیں
دیکھا۔ جبکہ وہ لوگ سامان شفٹ کر رہے تھے تب
میں نے ہی وہ اٹھا کر اوپر پہنچائے تھے۔ اس دن سے
میں نے ان تین حسیناؤں میں سے کسی سے بھی محبت
کرانے کا ارادہ ترک کر دیا تھا، لیکن آپ واقعی فرما دی
مانند جواں مرد ہیں۔ سینیٹور فاریو!“

”جیسا کہ“ وہ پھر بولا۔ ”میں نے سوچ لیا
”ٹھیک ہے۔“ پھر وہ بولا۔ ”میں نے سوچ لیا

”جیسا کہ“ وہ پھر بولا۔ ”میں نے سوچ لیا
”ٹھیک ہے۔“ پھر وہ بولا۔ ”میں نے سوچ لیا

”بھائی جان!“ اس نے اندر جھانک کر پوچھا۔
 ”میں آ جاؤں؟“
 جشید بے تابی سے اس کی جانب بڑھا۔ بالم کا ہاتھ
 کھینچ کر اس نے اندر کیا اور دروازے کی کنڈی لگادی۔
 ”ہائے اللہ بھائی جان! یہ کیا کر رہے ہیں؟“ وہ

چلایا۔
 ”ارے چپ کرو۔“ جشید نے گھبرا کر اس کے منہ
 پر ہاتھ رکھا پھر جھلا کر مٹایا۔ ”ایک تو یہ تمہارے
 دانت۔“

”ہی ہی۔۔۔“ اس نے فوراً مٹا کر لیا۔
 ”اندر کروا نہیں۔“

اس نے فٹ منہ بند کر لیا۔
 ”ار بالم!“ جشید نے قدرے خوشامدی انداز
 اختیار کیا تھا۔ ”ایک کام ہے تم سے کہنے کا۔۔۔“
 ”تمہارے کام تو کرنا ہیں بھائی جان! وہ ایک بھی
 کروں گا۔“

”یاد دینے۔۔۔ ایک۔۔۔ ایک کاغذ ہے۔۔۔“ اس
 نے ڈرتے ڈرتے جیب سے تمباکوا کاغذ نکالا۔ ”یہ“

کسی کو دینا ہے۔
 ”کس کو دوں؟“ اس نے کاغذ اچھلایا۔ ”باجی
 کو؟“

”ارے باپ رے۔۔۔“ اس نے گہرے گھر روو؟“ اس نے
 اداوی کی زبان استعمال کی۔ ”اپنے گھر میں یہ کسی کو
 نہیں دینا، کتنی بے ذکر ہی نہیں کرنا اس کا۔۔۔“

”واہی سے بھی ٹھیل!“
 ”او خبیث۔۔۔ حواسوں میں آ جاؤ! یہاں میرے
 گلے میں اتنی ہندو ہوانے کی ترکیبیں سوچ رہا ہے۔“

”پھر بتا میں نا بھائی جان! اس کو دوں؟“ وہ اٹھا گیا۔
 ”یہ لے دس روپے تیری خراچی!“ جشید نے
 اوجھڑا دھڑکیے کر دس کانوٹ اس کے حوالے کیا۔

بالم خوشی سے کھل اٹھا۔
 ”میں صدقے بھائی جان! میں وارنٹ!“
 ”اس بلن۔“ جشید اس کے کان میں سرگوشیاں

نے لگا۔

”یار جشید! آخر جوالی محبت نامہ کب موصول ہوگا
 میں انتظار کی گھڑیاں گن گن کر سنتی بھوسے لگا
 ہوں۔“

”بھائی جان! عاشقی صبر طلب کام ہے۔ تنہا کی تواری
 پر کان لگا رہیں۔“

جشید نے چٹپٹین بھری نگاہوں سے اسے دیکھا۔
 ”تم کتنے بدل گئے ہو میرے بھائی! ایسی عقل
 فراست پہلے کبھی تمہارے بے وقوفانہ سر پہ نہ
 جھلکی تھی۔“ آخر اس تبدیلی کا راز کیا ہے؟ کس
 تجسس خان کی وجہ سے تو یہ تبدیلی نہیں آئی؟

جشید نے سر آہ بھری۔
 ”اندر سے اندازہ لگایا آپ نے بھائی جان! یہ سب
 اسی تجسس خان کی کرشمے ہیں۔“

”واہ میرے بھائی! بیعت ہو تو ایسی، الو کو لوڑا
 ڈالا۔“

جشید نے سر اٹھا کر بدمزگی سے اسے
 دیکھا۔

”مثال دینے میں تو آپ ہمیشہ سے بے مثال رہے
 ہیں بھائی جان! آپ سے اطلاع عرض ہے کہ یہ محبت
 نہیں، رقابت کا کچھ شے ہے جہاں وفا نہیں جفا سرگرم

عمل کرتی ہے۔ وہ دھوکہ باز حسینہ میرے سب نوٹس اپنے
 ہضم کر رہی ہے۔ کسی مشہور ماہنامے کی رڈی کی ٹوکی
 ہو اور میرے سامنے وہ دکھائی دے گی گوارا نہیں کرتی۔“

”چچ چچ۔۔۔ جب ہی میں انکوں کچھ دن سے
 تمہاری صورت کلوادھولی کے گدھے جتنی ہی کیوں
 لگ رہی ہے۔ تو یہ ہے ہاں کا سبب۔ غم نہ کہ مرہ

بھائی! میں تمہارے اس غم میں برا بھلا کا شریک ہوں۔“
 ”کتنے دن بھائی جان! یہ شرکت داری آپ کو
 اس نہ آئے گی۔“ ابھی آپ کو ”م“ نے ”غم کا جوہر“

پورا اور اٹھانا ہو گا، کیونکہ میں اس میں ہرگز شرکت
 داری نہ کروں گا۔ کلوادھولی کے گدھے کا ذکر اس
 وقت تک کے لیے اٹھا رہا ہوں۔“

اسی لمحے بالم اپنی پتلی کمر پر چکاتا مشکتا وہاں سے گزرا۔
”ارے رے رے رے سنو بالم۔۔۔ او بانگے۔۔۔“

جمشید نے گھبرا کر اسے آوازیں دیں۔

”چائے کا وقت گزر چکا اپنے بھائی جان! باجی کہہ
رہی تھیں چائے صرف دو ٹائم بنے گی۔“ وہ مصروف
انداز میں ٹھہر کر بولا۔

”ارے توپ کا گولہ مارو چائے کو ادھر آؤ تم۔“ وہ
جھلایا۔

”جی، کیسے۔“ بالم نے قریب آکر کہا۔

”وہ وہ ڈنکے دیا؟“

”وہ؟ وہ کیا؟“ وہ الجھ کر بولا۔

”ارے وہی۔۔۔ وہی۔۔۔“

”خط کہہ دیجئے بھائی جان! کوئی حرج نہیں۔“

کھل کر بولا۔

”وہ میرا خط۔“ وہ دلی اور زور سے بولا۔

”ہاں جی، آئی کو دے دیا۔“ وہ کہہ کر جانے لگا تھا۔

”ہائیں؟“ وہ دونوں ہکا بکارہ گئے۔

پھر جمشید نے جست لگا کر اس کی گدی پکڑی۔

”کیا تم کو یاد ہے؟“ وہ نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

”بھائی جان! چھوڑیں مجھے۔۔۔ باجی۔۔۔“

آوازیں دہینے لگا۔

جمشید نے لپک کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

”ابے چپ کر ورنہ دوں گا ایک مکا۔“

وہ سہم کر خاموش بن گیا۔

”ہاں اب بتا۔“

”جمشید بھائی جان نے کہا تھا وہ جو سب سے گوری

باجی ہیں، ان کو وہ کاغذ دے دینا۔ میں اوپر گیا تو اٹکل

خورشید چاچا میاں اور آئی بیٹھے چائے پی رہے تھے۔

ان میں سب سے گوری آئی تھیں تو میں نے وہ کاغذ

ان کو دے دیا۔

”ہاں۔“ جمشید تورا کر بستر پر گئی۔

”ابے بے وقوف!“ جمشید نے اسے ٹیک دھب

رسید کی۔ ”بھائی جان نے ان کی بیٹیوں کے لیے کہا

تھا۔“

”تو جی۔ وہ تینوں تو واپس چلی گئی ہیں۔ میں ان کو کسے رچا؟“ وہ گردن سہلانے لگا۔ جنید مظلوم صورت بنا کر کچھ سوچنے لگا۔

”ہاں بس۔“ اس نے ناک چڑھائی۔ ”یہی فضول فضول موقعوں پر بہن کی یاد آتی ہے۔ ویسے تو کبھی میرا نام نہیں لینے آپ دونوں“ اور بھائی جان! کتنی خراب حرکت کی ہے آپ نے اب میرا سامنا ہو گا ان لڑکیوں سے تو مجھے کتنی شرم آئے گی۔“

”بیاری بہنا! افسوس کا مقام تو یہی ہے کہ ان لڑکیوں تک بات پہنچی ہی نہیں۔“ اس نے آہ بھری۔

”وہ ایک معصوم سا اظہار محبت تھا، سوسن چرس تو نہ تھی جو رستے میں ہی دھری گئی۔“

”تو اب میں کیا کروں؟“ وہ بھائی سے پوچھ کر بھی کیا سکتی ہوں؟“

”تم اوپر جا کر حالات کا جائزہ لے کر آؤ۔ حالات و تاثرات و واقعات نوٹ کر کے ہمیں عرض کر دو۔“ جنید بولا۔

”معاملات کوئی قدر اور جتنی باریک بینی سے مشاہدہ کرو۔ بات سننے کی سبیل گنیا ہوا سکتی ہے مشورہ دو۔“

”ہاں۔۔۔ میں مارا کھاؤں۔۔۔ آپ دونوں چھپے بیٹھے رہیں۔“

”بہنیں میری بہن۔۔۔ یقین کرو۔ ہم مارا کھانے میں تمہارا پورا پورا ساتھ دیں گے۔“ جمشید جذب سے بولا۔ غزل نے غصے سے سر جھٹک دیا۔

غزل جاں فزا پورٹ لے کر آئی تھی۔ ان دونوں کے مرجھائے ہوئے چہرے جی اٹھے۔

”آئی کو تو سمجھ ہی میں نہیں آیا کہ اس میں لکھا کیا ہے۔ انہوں نے نا۔۔۔ مجھی سے وہ کاغذ ڈانٹنگ میبل پر نمک دانی کے نیچے رکھ چھوڑا ہے۔ لیکن ان کا ارادہ ہے کہ وہ شام کو خورشید انکل سے وہ تحریر پڑھوا آئیں

گی۔ دراصل وہ سمجھ رہی ہیں کہ وہ کاغذ ششوار باجی کی پڑھائی سے متعلق کوئی چیز ہے۔“

”اوہ۔۔۔ کس قدر درست سمجھتی ہیں وہ۔“ جمشید نے دانت نکالے۔ ”واقعی وہ ’’منی‘‘ کی پڑھائی کی چیز ہے۔“

”دانت اندر کر میں بھائی جان اور یہ سوچیں کہ وہ واپس آسکیے لیا جائے۔ خورشید انکل ’’آئی نور ہاؤسیہ““ سادہ لوح ہرگز نہیں ہیں۔“

”تم کئی تھیں تو لے آئیں۔“ جمشید غزل پر بگڑا۔

”جی ہاں۔ احسان ماننا تو ایک طرف۔۔۔ لے آؤں۔۔۔ دھرنے۔۔۔ میں جھلا کیسے لے آتی؟ اتنی بات بھی میں نے بڑی مشکلوں سے اٹھوائی ہے، وہ تو نجانے کیا کیا بولتی رہتی ہیں۔ وہ تو شکر کریں جس وقت باہم خطرات کر رہے تھے خورشید انکل کا ضروری فون آگیا، ورنہ تو اس وقت ان سے پتہ نہ چلتا۔ اب انہوں نے انکل کے انتظار میں اسے ڈانٹنا نہیں برا رکھ چھوڑا ہے۔“

”کچھ کرو میرے بھائی! سمجھنے سے آہ بھر کر جنید دیکھا۔

UrduPhoto.com

”ان کی ڈانٹناگ نبیل لاؤنج کی مغرب دیوار سے لگی رکھی ہے۔“ جنید پر خیال انداز میں بولا۔

”ہاں تو اب بیٹھ کر وہ مزے مزے کے کھانے کھاتی ہیں۔“ جمشید بھی خیالوں میں مسکرایا۔ جنید نے اسے بری طرح سے گھورا۔

”میں نے تصور کی دنیا فی الوقت اس کو نڈی اور ہلبہر ڈنڈے سے آیا ہو کچھ بھائی جان! جوان کا کھانا پکانے میں استعمال ہوتا ہے۔ اس سے آگے جانا منع ہے۔“

”صحیح کہتے ہو برادر! اس نے سر آہ بھری۔

”اس کے کو نڈی اور ڈنڈے کے ساتھ ساتھ میرے تصور کے کینوس پر وادی چان کی چھری اور ابوجی کا جوتا بھی پیٹ ہو چکا ہے۔“

”ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ اس دیوار میں ایک کھڑکی

ہے۔ جس کے پٹ چوبیس گھنٹے وار ہوتے ہیں۔“

”اچھا تو کچھ؟“
”اس کھڑکی کے قریب سے ایک موٹا پائپ گزرتا

ہے۔“

”مقصود نکاسی۔“ جشید نے سر ہلایا۔
”تو بھائی جان۔ اگر آپ اس پائپ کے
سہارے چڑھ کر اس کھڑکی تک جاتے ہیں۔ تو ایک
ہاتھ کے فاصلے پر میز بڑی ہے۔ میرا مطلب ہے۔“
”برادر عزیز۔“ جشید نے اسے گھورا۔ ”تم
جانتے ہو کہ وہ پائپ لائن ٹواٹلٹ کی ہے اور تین جگہ
سے لیک ہے اور سوئے اتفاق اگر اس وقت چاچا میاں
ٹواٹلٹ میں ہوتے تو جانتے ہو میرے ساتھ کیا ہوگا؟
پوسٹ مارٹم کی رپورٹ ثابت کرے گی کہ موت
زہریلی گیس سے ہوئی ہے۔“

”لیکن بھائی جان! پوسٹ مارٹم کی رپورٹ تو
بہر حال بن کر رہے گی۔ خواہ اس میں لکھا ہو کہ موت
سر کے پچھلے حصے پر کوئی دہلی چڑھا مارنے سے ہوئی
ہے۔“

”کبھی بھائی جان! اس سے نظر اٹھ کر دیکھو
آنسو پونچھے۔ اتنی سی بات کہیں گے میرا جان و
ایمان دونوں کا نقصان کرنے پر تلے ہوئے ہو۔ آخر
تمہاری بے مثال دہانت کیا ہوئی۔ جیمز بانڈ کی اتنی
فلمیں دیکھ کر تم نے کیا سیکھا؟“
”جوش نہ دلائے بھائی!“ وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ”وہ
معمولی کاغذ حاصل کر لینا تو یوں چٹکیوں کا کام ہے۔“
جشید مسکرانے لگا تھا۔

Ujala @ Urdu.com

”یہ دیکھیے بھائی جان! جشید نے ایک سفید کپڑا سا
اس کی آنکھوں کے سامنے لہرایا۔ ”آپ کے مسئلے کا
بے داغ حل۔“
”ہائیں۔“ جشید نے اس کے ہاتھ سے وہ کپڑا سا
لے کر بغور معائنہ کیا۔ ”یہ گاؤ تکیے کاغذ آف؟ اور اتنا بڑا
اور بھٹا ہوا اس سے کیا ہوگا؟“

”بھائی جان! اگر یہ گاؤ تکیے کاغذ آف ہے تو ہر گز
ہماری پیاری وادی جان ہیں۔ یہ ان کا قدم اور غافل
برقع ہے بھائی جان! یہ جالی دار ٹوپی دیکھ رے ہیں اس
میں ہوا کی نکاسی کا کس قدر عمدہ انتظام رکھا گیا ہے
اس کو پہن کر دکھائیے۔“

اس نے آگے بڑھ کر وہ برقع جشید کو پہنا دیا۔
”اے میں۔۔۔ ارے۔۔۔ آف۔۔۔ یہ کیا بدترین
جس۔۔۔ وہ جالی میں بسے جھانکنے لگا۔
”کہیے، کہیسی ترکیب ہے؟ لیکن ٹھہرے آپ کی
مونچھیں براہم کر رہی ہیں۔ ان کو اندر ہی رکھیے تاہم
جالی سے باہر کیوں آ رہی ہیں۔“

”تمنی زور زور سے لہا لہاں ہوں گا تو مونچھیں تو اڑیں
گی ہی۔“ اس نے برقع اتار کر ایک طرف پھینک دیا۔

”پہنا تو پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے کی کہ موت دم گھٹنے کی
وجہ سے واقع ہوئی تھی۔“

”آپ تو بالکل ناکارہ ہیں بھائی جان!“ اس نے غصہ
آپا۔ ”چلتے تھے محبت کرنے، خبردار جو آپ نے آئندہ
محبت کا تار پٹا ہے۔“

”اوبھنے۔۔۔ میں اندر سے کتنی آں؟“ اس نے نہ
کمرے میں گھس کر تختی آواز میں پوچھا۔
”کون آئے؟“ وہ بولیں۔

”میں جی۔۔۔ ایک غریب عورت آں۔“ وہ سفید
برقع میں لیٹا اندر چلا آیا۔ ”تراہ لگی سی۔ پانی واسطے
آئی آں۔۔۔ بلا دوجی۔“

”آہو کھنسا! ضرور پیو۔ شربت پیو۔“ وہ اٹھ کر
فرق تک گئیں۔

جشید نے برق رفتاری سے میز پر نمک دانی کے نیچے
رکھا کاغذ چھینچ کر اٹھی میں دوچا۔

”اندرو سے نکلتے چاچا جی نے اس کی حرکت دیکھ لی۔
”اوبھ۔ کون اے تو۔۔۔؟“ وہ خطرناک تیوروں سے
اس کی جانب بڑھے۔ ”کی چکیا ایہ تھوں؟“ (یہاں)

